محمد اسحاق بھٹی

فتاویٰ حمّادیہ

گجرات (کاٹھیاواڑ) کا ایک فقہی مخطوطہ

(۴)

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو "المعارف" ماہ ستمبر)

جزیہ کن لوگوں سے نہ لیا جائے

یہ ایک فقہی سوال ہے کہ اسلامی حکومت میں جزیہ کن لوگوں سے لیا جائے گا اور کون لوگ اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اس ضمن میں فتاویٰ حمادیہ کے مصنّف نے کتاب السیر میں مسئلہ جہاد کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی بیان کیا ہے اور صاحبین (امام محمد اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ) کے نقطۂ نظر کی بھی وضاحت کی ہے مصنّف نے بتایا ہے کہ صاحبین کے نزدیک دس قسم کے لوگوں سے جزیہ نہیں وصول کیا جائے گا۔ یعنی (۱) بچوں سے، (۲) رہبان سے، (۳) اندھوں سے، (۴) پاگلوں سے، (۵) غلاموں سے، (۶) شیخ فانی سے، (۷) دائم المریض سے، (۸) اُن لوگوں سے جن کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہوں، (۹) اُن سے جو فقط عبادت گزار ہوں، اور (۱۰) معاشرہ کے نادار و مفلس افراد سے — مزید برآں امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں مفلوج سے بھی جزیہ نہیں لیا جائے گا۔[۱]

اس سے آگے چل کر فقہا نے اور بھی رعایت دی ہے۔ سغنانی کے حوالے سے فتاویٰ حمادیہ کے مصنّف لکھتے ہیں

ولو مرض الذمی السنۃ کلھا فلم یقدر ان یعمل وھو موسر انہ لایجب علیہ الجزیۃ[۲]

یعنی اگر (اسلامی مملکت میں) ذمی، کامل ایک سال کسی مرض میں مبتلا رہتا ہے اور مرض نے اِسے

---

[۱] ورق ۱۲۵ - [۲] ایضاً

کسی کام کے قابل نہیں رہنے دیا تو اگرچہ وہ آسودہ حال ہو، اس پر جزیہ واجب نہیں۔
مطلب یہ کہ غیر مسلموں کے ساتھ فقہائے عظام نے زیادہ سے زیادہ نرمی اختیار کرنے کے اصول وضع کیے ہیں۔

غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کے بارے میں

اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کے بارے میں بھی مصنف فتاویٰ نے (اسی (کتاب السیر) میں بحث کی ہے۔[1] انھوں نے اس ضمن میں اس سوال کا جواب دیا ہے کہ غیر مسلم اور ذمی خالص اسلامی مملکت میں اپنی عبادت گاہیں تعمیر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ مصنف نے مختلف فقہا کے اقوال درج کیے ہیں جن کا مفاد یہ ہے

۱۔ وہ نئی عبادت گاہیں تعمیر نہیں کر سکتے۔ البتہ پرانی عبادت گاہیں منہدم ہو جائیں یا قابلِ مرمت ہوں تو انھیں دوبارہ تعمیر اور مرمت کرا سکتے ہیں۔

۲۔ نئی عبادت گاہیں تعمیر کرنا ضروری ہو تو اپنے رہائشی مکانوں میں تعمیر کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ اصلاً مکان ہی کے حصے میں شامل ہوتی اور اسی کے تابع قرار پاتی ہیں۔ یہ رعایت بھی شہروں تک محدود ہے، دیہات اور بستیوں میں اس کی اجازت نہیں۔ اس لیے کہ خطرہ ہے وہ دیہات میں اپنے مراکز قائم کر کے وہاں کے ناواقف اور سادہ مزاج لوگوں کو گمراہ کریں گے۔

۳۔ جن آبادیوں کے دیہات میں اہلِ ذمہ زیادہ تعداد میں آباد ہوں، وہاں کے دیہات کے رہائشی مکانوں میں بھی وہ عبادت گاہیں تعمیر کر سکتے ہیں۔[2] ... لیکن جزیرۂ عرب کے دیہات و امصار (شہروں) میں تعمیر نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "جزیرۂ عرب میں دو دین (اسلام اور غیر اسلام) جمع نہیں ہو سکتے۔"

۴۔ قدیم عبادت گاہیں کسی صورت میں منہدم نہیں کی جائیں گی۔

---

[1] دیکھیے ورق ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷

[2] یہاں مصنف نے کوفہ کے دیہات کی مثال دی ہے اور لکھا ہے کہ وہاں اہلِ ذمہ دوسرے علاقوں کے دیہات کی نسبت زیادہ تعداد میں تھے۔

۵ - اگر کوئی غیر مسلم علاقہ لڑائی سے فتح کیا جائے تو اس میں غیر مسلموں کی عبادت گاہیں اس صورت میں منہدم کی جاسکتی ہیں کہ انھیں کہیں مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا اڈہ نہ بنالیا جائے۔ اور اگر کوئی علاقہ صلح کے ساتھ قبضہ میں لیا جائے تو اس کی عبادت گاہوں کا انہدام نہ کیا جائے

معاوضہ اور تنخواہ کے مستحق لوگ

کتاب السیر میں مصنف نے بہت سے فقہی مسائل کو شائستہ التفات ٹھہرایا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ معاوضہ اور تنخواہ کے مستحق کون لوگ ہیں۔ المحیط کے حوالے سے فتاویٰ حمادیہ کے مصنف تحریر فرماتے ہیں[1]۔

واهل العطاء من يعمل لعامة المسلمين كالقاضى والمفتى والمدرس والغازى[1]

جو لوگ عامۂ مسلمین کی خدمت پر متعین ہیں اور ان کے نام رجسٹر میں درج ہیں۔ مثلاً قاضی، مفتی مدرس اور نمازی، انھیں باقاعدہ (سالانہ یا جو طریقہ رائج ہو، اس کے مطابق) مسلمانوں کے بیت المال سے، اتنا معاوضہ ملنا چاہیے، جس سے ان کی ضروریات پوری ہوسکیں۔

وہ اس معاوضہ کے مستحق کیوں ہیں؟ مصنف فرماتے ہیں۔

وانما استحقوا ذلك لانهم فرغوا انفسهم لعمل المسلمين فيكون كفايتهم فى مال من بيت مال المسلمين[2]۔	یعنی وہ اس معاوضہ کا استحقاق اس بنا پر رکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی خدمت کے لیے فارغ کرلیا ہے اور ان کی کفالت کی ذمہ داری مسلمانوں کے بیت المال پر عائد ہوتی ہے۔

اس مسئلے پر مصنف نے کتاب القضا میں بھی بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قاضی اور دیگر عمالِ حکومت معاوضہ لینے میں حق بجانب ہیں، کیونکہ ان کی مصروفیات اس نوعیت کی ہیں کہ وہ اور کوئی کام نہیں کرسکتے، اسی میں الجھے رہتے ہیں۔ خلفائے راشدین ——— حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ——— بھی بیت المال سے معاوضہ لیتے تھے۔ اسی طرح علماء و فقہا کا کہنا ہے کہ معلمینِ قرآن بھی معاوضہ لے سکتے ہیں[3]۔

---

[1] ورق ۳۶ [2] ایضاً [3] ورق ۲۱۶

بغاوت و خروج

مختلف فقہی کتابوں کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں۔ امام عادل کے خلاف خروج و بغاوت کا علم ہرگز بلند نہیں کرنا چاہیے۔ مصنف مزید لکھتے ہیں۔ فقہا نے بغاوت و خروج کے بارے میں جو "امامِ عادل" کی قید لگائی ہے، اس کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ اگر امام عادل نہ ہو تو اس کی اعانت نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس کے خلاف خروج و بغاوت ضروری ہے۔ اسی ضمن میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "امام حق وہ ہے، جس میں صحتِ امامت کی تمام شرائط جمع ہوں اور وہ شرائط یہ ہیں۔ مسلمان ہو، احکام شرع کا پابند ہو، عاقل و فہیم ہو، ذہن رسا کا مالک ہو، عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو، مسلمانوں کی اکثریت نے اُسے حکمران تسلیم کر لیا ہو اور وہ اس کی حکومت سے مطمئن ہوں، اس کے سامنے اصل مقصد اعلائے اسلام اور مسلمانوں کو تقویت پہنچانا ہو، مسلمانوں کا خون، ان کے اموال و اسباب اور اُن کی عزت و آبرو اس سے محفوظ ہو اور وہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرتا ہو، شریعت کے مطابق عشر، خراج اور جزیہ وصول کرتا ہو، مسلمانوں کے ساتھ اس طرح مشفقانہ اور عادلانہ برتاؤ کرتا ہو جس طرح کہ مہربان باپ بیٹے کے ساتھ اور شفیق بھائی اپنے بھائی سے کرتا ہے، رعایا کے لیے نرم مزاج، حلیم الطبع اور خوش اخلاق ہو، کم عقل نہ ہو، اسلامی حکومت کی سرحدوں کا محافظ ہو۔" مصنف لکھتے ہیں۔

ومن لم یکن کذلک فلیس	یعنی جو ان اوصاف کا حامل نہیں، وہ امام حق
ھو الامام الحق فلا یجب اعانتہ	نہیں ہو سکتا، اس کی اعانت کرنا ضروری نہیں بلکہ
بل یجب القتال معہ والخروج	اس کے ساتھ قتال واجب ہے اور اس کے خلاف
علیہ حتی یستقیم[1]	خروج ضروری ہے۔ حتیٰ کہ وہ راہِ راست پر آجائے

مسجد کا وقف

فتاویٰ میں کتاب الوقف کے تحت وقف کے سلسلے میں خاص تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس میں ایک مسئلہ یہ واضح کیا گیا ہے کہ ایک شخص مسجد کے لیے جگہ وقف کرتا ہے اور وہاں اپنے خرچ سے مسجد

---

[1] ورق ۱۲۷

تعمیر کرتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے، کیا وہ اس مسجد میں اپنی مرضی سے مؤذن یا امام مقرر کر سکتا ہے ؟

مصنّفِ فتاویٰ، جواب دیتے ہیں، واقف اپنی پسند کے مؤذن اور امام کا تقرر نہیں کر سکتا، کیونکہ وقف کے بعد جب مسجد پر اس کا کوئی ذاتی حق نہیں رہا تو اس کی کسی چیز پر بھی (جس میں مؤذن امام اور خادم بھی شامل ہیں) اس کا کوئی مستحق نہیں۔ وہ تنہا اِس سلسلے میں فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں بلکہ اس نوع کے تمام معاملات مسجد کے نمازیوں اور محلہ یا گاؤں (جہاں مسجد تعمیر ہے) کے لوگوں کے مشورہ سے طے پائیں گے اور وہی کچھ ہوگا جو وہ کہیں گے، کیونکہ مسجد اس کی ملکیت نہیں بلکہ وقف ہے اور وقف کے حقوق سب کے لیے یکساں ہیں۔

اپیل کا حق

کتاب کا ایک اہم باب کتاب القضاء ہے جس میں مصنف نے متعدد امور پر بحث کی ہے مثلاً قاضی ایک فیصلہ صادر کرتا ہے اور اس کا نفاذ بھی ہو جاتا ہے، لیکن فریقین میں سے ایک فریق اس فیصلہ سے مطمئن نہیں۔ کیا ایسی صورت میں کوئی ایک فریق، دوسری عدالت میں یا اس سے اعلیٰ عدالت میں اس قضیہ کو لے جا سکتا ہے ؟

مصنّف کہتے ہیں اس مسئلہ کے بارے میں فقہا سے مختلف آرا منقول ہیں۔ بعض کے نزدیک وہی فیصلہ آخری سمجھا جائے گا اور نافذ ہوگا جو پہلی عدالت نے کیا ہے اور بعض کے نزدیک دوسری عدالت کے دروازے پر بھی دستک دی جا سکتی ہے۔ مصنّف لکھتے ہیں، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس باب میں دو قول ہیں، دوسری عدالت میں جانے کا قول زیادہ صحیح ہے اور اگر دوسرا قاضی پہلے قاضی کی رائے کے خلاف فیصلہ کر دے تو وہی فیصلہ نافذ ہوگا۔

ذلک علی قول ابی حنیفۃ رضی اللہ عنہ لو قضی بخلاف رایہ ینفذ قضاءہ فی اعم الروایتین[۱] بالفاظ واضح اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فریق مقدمہ کو دوسری عدالت میں جانے اور اپنے حقوق کے لیے اعلیٰ عدالت میں اپیل کرنے کا حق حاصل ہے۔

اجتہاد فی القضاء

عدل و انصاف کی مسند پر قاضی اجتہاد سے بھی کام لے سکتا ہے، لیکن اس سلسلے میں اسے یہ بات

---

[۱] ورق ۲۰۱

بہر حال ملحوظ رکھنا پڑے گی کہ اجتہاد فی القضاء سے نص اور اجماعِ امت کی مخالفت نہ ہوتی ہو۔ اگر اجتہادِ قاضی ان دونوں اصولوں کی مخالفت پر مبنی ہوگا تو باطل قرار پائے گا[۱] کیونکہ نص اور اجماع کو اجتہاد پر فوقیت حاصل ہے اور اجتہاد نص اور اجماع کی روشنی میں کیا جاتا ہے، نہ کہ اس کو نظرانداز کر کے۔

غائب کے متعلق قضائے قاضی

کتاب القضاء میں مصنف نے اس مسئلے کو بھی لائقِ اعتنا ٹھہرایا ہے کہ اگر مدعی علیہ غائب ہو اور عدالت کے سامنے اس کے موقف کی وضاحت کی کوئی صورت نہیں، تو کیا قاضی، اس کی طرف سے وکیل کی خدمات حاصل کر سکتا ہے؟

مصنف کہتے ہیں نہیں کر سکتا۔ جب وکیل کو کسی معاملے کا علم ہی نہیں اور مدعی علیہ نے اس کو اپنی طرف سے وکالت کی اجازت ہی نہیں دی اور اپنا نقطۂ نظر اس کے ذہن نشین ہی نہیں کرایا تو وکالت کس چیز کی؟

اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ اگر قاضی ایسے شخص کے خلاف جو عدالت سے غائب ہے، دلائل و ثبوت کی بنا پر فیصلہ دے دے تو یہ فیصلہ نافذ متصور ہوگا یا نہیں؟

مصنف لکھتے ہیں، اس سوال سے متعلق کتب فقہ میں دو روایتیں منقول ہیں شمس الائمہ سرخسی اور شیخ الاسلام ابوبکر سے جو روایت منقول ہے، وہ یہ ہے کہ یہ فیصلہ نافذ ہوگا۔ اور بعض دیگر مشائخ فقہ کا قول ہے کہ نافذ نہیں ہوگا کیونکہ قاضی براہِ راست فریقین کا نقطۂ نظر سنے اور سمجھے بغیر کوئی فیصلہ نافذ کرنے کا مجاز نہیں۔ البتہ اگر غائب کی طرف سے کسی شخص نے (اس کی اجازت سے) وکالت کے فرائض انجام دیے ہوں تو قضائے قاضی نافذ ہوگا وعلیہ الفتویٰ[۲] (فتویٰ اسی پر ہے)

آخری بیان کی اہمیت

فقہی اعتبار سے آخری بیان کو بہت اہمیت حاصل ہے مصنف لکھتے ہیں اگر ایک شخص عدالت میں کوئی بیان یا شہادت دے اور بعد میں غائب ہو جائے یا وفات پا جائے اور دوسری مرتبہ بیان دینے کا موقع نہ ملے تو آخری بیان صحیح سمجھا جائے گا اور قاضی اسی کی روشنی میں فیصلہ دے گا[۳]

---

[۱] ورق ۲۰۱ [۲] ورق ۲۰۲ [۳] ایضاً

آدابِ قاضی

فقہا نے قاضی کے لیے کچھ آداب مقرر کیے ہیں اور کچھ حدود متعین کی ہیں۔ جن پر عمل کرنا ضروری ہے مثلاً فتاویٰ تاتارخانیہ کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں۔ قاضی اگر مندرجہ ذیل دس حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں ہو تو اس کا فیصلہ نافذ نہیں ہوگا۔

(۱) غصے کی حالت میں ہو' (۲) بھوک کی حالت میں ہو' (۳) پیاس کی حالت میں ہو' (۴) محصور ہو (۵) بول و براز کے تقاضوں کو روک رکھا ہو' (۶) سواری پر سوار ہو' (۷) راستے میں چل رہا ہو' (۸) نیند سے مغلوب ہو' (۹) حالتِ مرض میں ہو' اور (۱۰) کسی نوع کے درد میں مبتلا ہو —— اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حالتوں میں سے کسی حالت میں عقل و خرد کا توازن قائم نہیں رہ سکتا۔

اس کے ساتھ ہی مصنف سغنانی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ قاضی کو عمدہ لباس زیب تن کرکے عدالت میں آنا چاہیے اور گفتگو اور حرکات و سکنات میں انتہائی سنجیدگی کا ثبوت بہم پہنچانا چاہیے علاوہ ازیں اسے مدعی اور مدعی علیہ کے سامنے نہ زبان سے کہنا چاہیے اور نہ عمل و حرکات سے احساس کرانا چاہیے کہ میں طولِ جلسہ کی وجہ سے تھک گیا ہوں، اسے عدالت کی کرسی پر بار بار پہلو نہیں بدلنا چاہیے اور نہ انگڑائی لینی چاہیے بلکہ پورے وقار سے اپنی مسند پر بیٹھنا چاہیے، نہ مقدمہ کے کسی فریق سے مزاح نہیں کرنا چاہیے، نہ کسی کو نشانۂ استہزا بنانا چاہیے اور نہ ان کے سامنے ہنسنا چاہیے، نہ کسی کو کسی قسم کا اشارہ کرنا چاہیے، نہ ترش روئی اور تنک مزاجی کا اظہار کرنا چاہیے، نہ انھیں ڈرانا دھمکانا چاہیے، نہ کسی طرح متاثر کرنا چاہیے اور نہ انھیں یہ کہنا چاہیے کہ وہ جلدی کریں، فریقین کے بیانات سننے اور فیصلہ کرنے میں عجلت نہیں کرنی چاہیے، قاضی کو عین وقت پر عدالت کی مسند پر بیٹھ جانا چاہیے اور سامنے ایک ایسا آدمی کھڑا کرنا چاہیے جو نہ کسی کو اس کے بالکل قریب آنے دے اور نہ بلا اجازت کوئی بات کرنے دے۔ اس آدمی کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ کمرۂ عدالت میں سب حاضرین کو خاص ترتیب اور قرینے سے بٹھائے اور شور نہ کرنے دے تاکہ قاضی کے اطمینان میں خلل نہ پڑے اور اس کا ذہن دوسری طرف منتقل نہ ہو اور وہ کامل سکون اور توجہ سے اپنے مفوضہ فرائض انجام دے سکے۔ قاضی کسی فریق پر یہ تاثر نہ پیدا ہونے دے کہ اس کی کسی بات یا کسی اشارے سے، دوسرے فریق کی حمایت کا پہلو نکلتا ہے۔ وہ مدعی اور مدعی علیہ

کی باتیں باقاعدہ لکھتا جائے، آدابِ قاضی میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کے پاس ایک رجسٹر ہو جس میں مقدمہ کی تمام کارروائی، شہادتیں اور فریقین کے بیانات درج کیے جائیں۔[1]

آگے چل کر آدابِ قاضی کے ضمن میں فتاویٰ خانیہ کے حوالے سے مرقوم ہے کہ جس طرح قاضی رشوت نہیں لے سکتا، اسی طرح اس اجنبی سے کوئی تحفہ بھی قبول نہیں کر سکتا، جس سے نہ پہلے سے اس کے ذاتی مراسم ہیں اور نہ اس نے اس سے قبل کبھی اس کو کوئی تحفہ پیش کیا۔ نہ وہ کسی سے قرض لے سکتا ہے اور نہ مالی امداد طلب کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ لوگ اس کے عہدہ و منصب سے ناجائز مراعات اور مفادات نہ حاصل کر سکیں۔[2]

قرض کی وصولی

الحاوی کے حوالے سے مصنف فتاویٰ رقم طراز ہیں کہ اگر قرض خواہ کسی پر دعویٰ کرے کہ یہ میرا مقروض ہے اور قرض ادا نہیں کرتا اور تفصیلات سننے کے بعد قاضی اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ مدعی حق بجانب ہے مگر مقروض، بصورت نقد قرض ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور اس کے پاس رہائشی مکان کے علاوہ اور کچھ نہیں تو قاضی اس کا مکان فروخت کر کے قرض خواہ کا قرض ادا کرنے کا مجاز ہے۔

سئل ابوبکر رحمہ اللہ عن مدیون لیس لہ الا دار یسکنہا، قال یبیعہا القاضی فیقضی دینہ[3]

امام محمد اور امام ابو یوسف کے نزدیک قاضی، مقروض کا مال و متاع بھی فروخت کر کے اس کی رقم قرض خواہ کو دے سکتا ہے۔[4]

اشتہار و منادی کے ذریعے ملزم کی تلاش

مدعی بار بار مدعی علیہ کے مکان پر جاتا ہے اور عدالت بھی اپنے ذرائع سے اس کو طلب کرتی ہے مگر نہ وہ گھر پر ملتا ہے اور نہ عدالت میں حاضر ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں عدالت اس کے مکان پر اپنا ایک وکیل (نمائندہ) بھیجے، جس کے ساتھ عدالت کی طرف سے دو گواہ بھی ہوں، وہ نمائندہ مسلسل تین روز دن میں تین تین بار اس کے مکان پر جائے اور دو گواہوں کی موجودگی میں اس کے دروازے

---

[1] ورق ۲۰۹، ۲۱۰ [2] ورق ۲۱۷ [3] ورق ۲۱۱ [4] ایضاً

پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کرے۔ "فلاں بن فلاں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت، قاضی کی عدالت میں حاضر ہو اور فلاں الزام کے بارے میں جو فلاں شخص کی طرف سے اس پر عائد کیا گیا ہے اپنی پوزیشن واضح کرے۔ اگر وہ تاریخ مقررہ اور وقتِ مقررہ پر عدالت میں حاضر نہ ہوگا اور نہ اپنا وکیل بھیجے گا اور نہ کوئی اطلاع دے گا تو قاضی اس کی طرف سے ایک وکیل مقرر کر کے عائد شدہ الزام کے بارے میں شہادتیں لے گا۔ اور شہادتوں کی روشنی میں کسی واضح نتیجے پر پہنچنے کے بعد فیصلہ صادر کر دے گا"[1]

اس سے ثابت ہوا کہ عدالت میں حاضر کرنے کے لیے مدعی علیہ کی تلاش کی کوشش قاضی کے فرائض میں داخل ہے اور اس سلسلے میں اسے ہر وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو اس زمانے میں مروج ہو اور جس سے مدعی علیہ کی تلاش میں مدد مل سکے۔ ورنہ اسے یک طرفہ فیصلہ دینے کا حق حاصل ہے

مقروض کا بیان قابلِ اعتماد ہوگا یا قرض خواہ کا؟

قاضی کی عدالت میں قرض خواہ کہتا ہے کہ مقروض کی مالی حالت بہتر ہے اور وہ قرض ادا کر سکتا ہے۔ اور مقروض بیان دیتا ہے کہ میں مالی اعتبار سے کمزور حالت میں ہوں اور قرض ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اس صورت میں بعض ائمۂ فقہ کے نزدیک مقروض کا بیان قابلِ اعتماد ہوگا۔ اور بعض کہتے ہیں قاضی کو اس معاملہ میں لوگوں کی شہادتیں لینی چاہییں اور شہادتوں کی روشنی میں فیصلہ کرنا چاہیے[2]

اگر محبوس، جیل میں بیمار پڑ جائے

ایک شخص بعض جھگڑوں کے سلسلے میں قید خانے میں محبوس ہے اور بیمار پڑ جاتا ہے، تو قاضی کا فرض ہے کہ قید خانہ کے عملے کو اس کے علاج معالجہ کا حکم دے اور ایک خادم بھی مہیا کرے — اور اگر علاج و خدمت کے باوجود بیماری شدت اختیار کر لیتی ہے اور قید خانہ میں علاج کی کوئی مؤثر صورت نہیں ہے تو قاضی کو چاہیے کہ اس کی رہائی کے احکام جاری کر دے، کیونکہ حبس سے اصل مقصد اس کو سزا دینا ہے نہ کہ ہلاک کرنا[3]

---

[1] ورق ۲۱۲ [2] ورق ۲۱۴ [3] ورق ۲۱۵ ؎

وثیقہ نویسی وغیرہ کی اُجرت

پہلے زمانے میں موجودہ زمانے کی نسبت عدالت کا عملہ بہت محدود تھا اور بہت سے کام قاضی کو خود ہی کرنا پڑتے تھے ۔ مثلاً نقل نویسی ، وثیقہ نویسی ، توقیعات (مقدمہ کے کاغذات پر مہریں لگانا) اور عدالت کی کاروائی کا رجسٹر میں اندراج وغیرہ وغیرہ ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کیا قاضی ان چیزوں کی اُجرت لے سکتا ہے ؟

مصنف فتاویٰ متعدد فقہا کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں —— "لے سکتا ہے" ۔ الفاظ یہ ہیں

القاضی یاخذ الاجرۃ لکتابۃ السجلات والوثائق والتوقیعات[1]

مصنف مزید لکھتے ہیں ۔

لیکن قاضی کو اس ضمن میں یہ احتیاط برتنا پڑے گا کہ اگر احاطہ عدالت میں اس قسم کا کام اور لوگ بھی کرتے ہوں تو اُن لوگوں کی اُجرت سے نسبۃً کم اُجرت لے ۔ اس لیے کہ اسے منصب قضا کی تنخواہ بیت المال (حکومت کے خزانے) سے بھی تو ملتی ہے[2]

اس سے معلوم ہوا کہ مقدمہ کے کاغذات بہتر طور سے تیار کرنا ، تصدیقی مہریں لگانا ، کاغذات پر عدالتی ٹکٹیں چسپاں کرنا ، وثائق نویسی اور مقدمہ کی کاروائی کی نقول مہیا کرنا وغیرہ امور ضروری ہیں اور قاضی کو ان پر عمل کرنا چاہیے اور اس تمام معاملے کو اس اسلوب سے چلانا چاہیے کہ ہر چیز اپنی جگہ باقاعدہ اور موزوں ہو —— نیز ان کو مکمل کرنے اور سلیقے سے چلانے کے لیے اجرت بھی لی اور دی جا سکتی ہے اگر خود قاضی کو یہ زائد کام کرنا پڑے تو وہ بھی اس پر اُجرت لے سکتا ہے ۔ (باقی آئندہ)

---

[1] ورق ۲۱۷ ۔ [2] ایضاً